# نامور دانشور نوم چومسکی کی
# ڈاکٹر پرویز ہود بھائی کے ساتھ خصوصی گفتگو

(اکتوبر ۲۰۱۷ء)

پرویز ہود بھائی: ہیلو نوم۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ میرے ساتھ ہیں۔ ایریزونا میں اس وقت صبح ہوگی، جب کہ یہاں اسلام آباد میں شام ہے۔ آپ کیسے ہیں؟

نوم چومسکی: میں ٹھیک ہوں۔

پرویز ہود بھائی: نوم، میں کئی موضوعات پر آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں۔ میں اپنی گفتگو کا آغاز اس سے کروں گا کہ یوں دکھائی دیتا ہے جیسے انسان ایک بار پھر سے قبیلوں میں بٹ رہا ہے اور ہم ایک بار پھر اپنی ابتدائی وفاداریوں کی طرف لوٹ رہے ہیں، جیسا کہ مذہب یا قوم پرستی۔ یہ سب قریباً ہر جانب ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ مثال کے طور پر ایسا بریگزٹ (Brexit) کے موقع پر ہوا، اسی طرح یورپ میں انتہائی دائیں بازو کا ابھرنا اور امریکہ میں ڈونلڈ ٹرمپ کا صدر بننا۔ اسی طرح اگر ہم پاکستان کی بات کریں تو سنی انتہا پسندوں کے ہاتھوں اہل تشیع کا نشانہ بننا اور مسیحیوں، ہندوؤں اور احمدیوں کے لئے زمین تنگ ہونا شامل ہے۔ اور اگر ہم بھارت پر نظر دوڑائیں تو یوں لگتا ہے کہ وہاں ہر کوئی گائے کی حفاظت کے ہیجان میں مبتلا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا جب یورپ میں روشن خیالی کی لہر چلی اور مجھے علم ہے کہ آپ جان سٹیورٹ مل (John Stuart Mill) کے لئے توصیفی جذبات رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس آج کے حالات دیکھ کر کیا ایسا تاثر نہیں ابھرتا کہ انسان نے ترقی کی راہ سے اپنے قدم ہٹا لئے ہیں؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟

نوم چومسکی: میرا عہد طفولیت ۱۹۳۰ء کی دہائی میں گزرا ہے۔ بچپن ہونے کے باوجود میں نے یہ مشاہدہ کیا کہ ملک ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا اور بے پناہ بے روزگاری اور فقر و فاقہ نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ یورپ میں جرمنی اور اٹلی کو دیکھیں تو وہاں فسطائیت کا راج تھا۔ میری پیدائش سے برسوں پہلے امریکہ کھلے عام مسولینی کی حمایت کر رہا تھا۔ تیس کی دہائی کے آغاز میں جرمنی میں نازی ازم نے اپنے پاؤں جما لئے۔ ۱۹۳۸ء میں آسٹریا بھی چت ہو گیا۔ یہی حال چیکوسلوا کیا کا بھی ہوا۔ اسی طرح اسپین میں فرانسسکو فرانکو (Francisco Franco) کی فسطائی حکومت نے قبضہ کر لیا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے اپنا پہلا آرٹیکل فروری ۱۹۳۹ء میں سقوط بارسلونا کے موقع پر لکھا۔ اس کا موضوع بھی فسطائیت میں بے پناہ اضافہ تھا جو پوری دنیا میں اپنا اجارہ قائم کرتا دکھائی دے رہا تھا۔ تفصیل میں جائے بغیر یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ مشرقی ایشیا میں جاپان ہولناک مظالم ڈھا رہا تھا۔ یہ سارا منظر نامہ آج کے مقابلے میں کہیں ہولناک تھا۔ یعنی یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا آج جس ڈگر پہ چل رہی ہے، یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہم ماضی میں اس سے بھی زیادہ پریشان کن حالات کا سامنا کر چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسری جنگ عظیم اگر ایک برس مزید جاری رہتی تو ممکن تھا کہ جرمنی فتح یاب ہو جاتا۔ ہمیں آج امریکہ کی اُس وقت کی منصوبہ بندی کے بارے میں معلوم ہے کہ جنگ کے ابتدائی برسوں، یعنی ۱۹۳۹ء سے لے کر ۱۹۴۳ء میں سٹالنگراڈ (Stalingrad) تک، امریکی منصوبہ ساز مستقبل کے لئے ایک ایسی دنیا تشکیل دینا چاہتے تھے جس میں جزوی طور پر امریکہ اور جزوی طور پر جرمنی، یعنی دونوں کی بالادستی ہو۔ یوں یوریشیا کے آدھے یا ایک بڑے حصے پر نازیوں کا غلبہ ہونا تھا۔ کیا ہم نے ایسا ہوتا دیکھا؟ ہاں، ابھی بھی بہت کچھ برا ہو رہا ہے مگر ویسا برا تو نہیں ہوا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ روشن خیالی پر نازی ازم سے زیادہ سخت گیر حملہ کوئی اور نہیں ہوا، یہاں تک کہ معروف شخصیات نے بھی اس کی حمایت کی، جیسا کہ مارٹن ہائیڈیگر (Martin

ہائیڈیگر (Heidegger) نے ۱۹۳۵ء میں لکھا کہ یونان کی عظیم الشان تہذیب کو مشرق اور مغرب، دونوں اطراف کے وحشیوں سے بچانے کے لئے نازیوں کی موجودگی میں جرمنی واحد امید کی کرن ہے۔ میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ موجودہ حالات اچھے نہیں مگر اس قدر برے بھی نہیں جتنا ہم اس سے پہلے تاریخ میں دیکھ چکے ہیں۔ لہٰذا پہلی بات یہ کہ ہمیں اپنے تجزیے میں درست تناسب کا احساس رکھنا ہوگا۔ دوسرا یہ کہ آئیں کچھ دیگر معاملات کو بھی دیکھ لیں۔ پہلی جنگ عظیم بلاشبہ ایک ہولناک تجربہ تھا۔ جنگ کے فوری بعد امریکہ میں ووڈرو ولسن (Woodrow Wilson) کی انتظامیہ نے امریکی تاریخ کا سیاہ باب رقم کیا۔ ہزارہا لوگوں کو ملک بدر کر دیا گیا، بڑی تعداد میں لوگوں کو قید میں رکھا گیا، مزدور تحریک کو کچل دیا گیا اور آزادانہ سوچ کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ یہ ایسا بدترین جبر تھا جو پہلے کبھی رونما نہ ہوا تھا۔ اگر ہم تاریخ میں مزید پیچھے جائیں اور دیکھیں کہ انیسویں صدی میں امریکہ کیا کر رہا تھا تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسانی تاریخ میں غلامی کے سب سے وحشت ناک اور بدترین نظام کو چلا رہا تھا۔ وہ بڑے منظّم انداز میں قدم بہ قدم مقامی آبادی کی نسل کُشی کر رہا تھا، اور یہ عمل انیسویں صدی کے اواخر تک جاری رہا۔ اسی طرح اگر برطانوی راج اور اس کی سامراجی پالیسی پر نگاہ ڈالیں تو وافر مقدار میں خوراک ہونے کے باوجود بھارت میں قحط کے ہاتھوں لاکھوں انسانوں کو مرنے دیا گیا۔ یہ عمل ۱۹۴۳ء تک جاری رہا جب چرچل نے فیصلہ کیا کہ انگلستان کے لوگوں کو سفید روٹی چاہیئے، اور اس کے نتیجے میں بنگال کے دو ملین افراد کو جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اس سب سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پہلے حالات کس قدر بھیانک تھے۔ آج کے حالات برے ہونے کے باوجود اتنے ہولناک نہیں۔ اب بہت سے معاملات میں بہتری دکھائی دیتی ہے۔

اگر ہم دوسری جنگ عظیم کے بعد کی مغربی دنیا کا مشاہدہ کریں تو امریکہ کی تاریخ میں نمو (growth)، پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں سب سے اونچی سطح پر تھی۔ معاشی انہدام نہیں تھا، بڑی حد تک مساوات کے اصول کارفرما تھے، افریقی امریکیوں کو وہاں کے نظام میں داخلے کی اجازت مل رہی تھی اور شہری حقوق میں بہتری دکھائی دی رہی تھی۔ اگرچہ بہت کچھ ابھی بھی درست نہیں تھا مگر امریکہ بحیثیت مجموعی بہتری کی طرف گامزن تھا۔ یہ سلسلہ ستر کی دہائی تک چلا۔ پھر سماجی اور معاشی پالیسیوں میں تبدیلی آ گئی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مزدوروں کی عسکریت اور دیگر سرگرمیوں (activism) کے نتیجے میں آمدنی کی شرح میں کمی آ گئی تھی۔ جمہوریت کی ایسی فعالیت کے بارے میں دستاویزات اور مشن رپورٹس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ طے کر لیا گیا کہ معاملات کو حکومتی اختیار کے تابع کرنا ضروری ہے۔ اور پھر نیولبرل پالیسیوں میں تبدیلیاں آئیں، جن کے متوقع اثرات ظاہر ہوئے۔ انہوں نے اگرچہ پہلے جیسا تو نہیں، مگر ایک مناسب حد تک منافع کی شرح کو بحال کیا۔ ۲۰۰۷ء میں صورت یہ تھی کہ اکثریتی آبادی کی اجرت اور منافع میں جمود یا کمی واقع ہو چکی تھی۔ ۲۰۰۷ء کے اقتصادی زوال (crash) سے قبل امریکی محنت کشوں کی حقیقی اجرت اس سے بھی کم تھی جتنی کہ ۱۹۷۹ء میں نیولبرل تجربے کے آغاز سے قبل تھی۔ جمود کی یہ صورتحال اور دولت کا ایک خاص طبقے میں ارتکاز اس خود تقویتی دورے (self-reinforcing cycle) کا حصہ ہے، جس میں پالیسیاں اپنا حصہ ڈالتی ہیں۔ یوں ریگولیشن کے ساتھ ایک کے بعد دوسرا اقتصادی زوال سامنے آتا رہتا ہے۔ اب ریپبلکن پارٹی کے باہر کم از کم اسے ایک مسئلے کے طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے، اگرچہ اس بارے میں کچھ خاص اقدامات نہیں اٹھائے گئے۔ یورپ کو دیکھیں تو وہاں صورتحال اس سے بھی ابتر ہے۔ یورپ کے آسٹیرٹی (austerity) پروگرام کو ایک ثلاثہ (troika) چلا رہا ہے۔ جس طرز پر یورپ کا نظام تشکیل دیا گیا ہے وہ جمہوریت کی بیخ کنی کر رہا ہے۔ جمہوری فیصلہ سازی کا عمل قومی مرحلے پر نمائندہ افراد کی بجائے غیر منتخب بیوروکریسی کے ہاتھوں میں چلا گیا ہے۔ یورپی کمیشن، آئی ایم ایف اور سنٹرل بنک، یہ وہ ثلاثہ ہے جو اس سارے عمل کی پشت پر ہے۔ حکومتوں کی پالیسیوں میں لوگوں کی رائے کا کوئی عمل دخل نہیں رہا۔ وہ اپنے مسائل کے ساتھ رہنے پر مجبور ہیں، اور انہیں اس حقیقت کا پورا ادراک ہے۔ ان مرکزی اداروں کے بارے میں یورپ اور امریکہ میں غم و غصہ پایا جاتا ہے۔ سیاسی جماعتیں، جو ملکی ادارے چلاتی ہیں، لوگوں کی اعانت کر رہی ہیں۔ امریکی انتخابات کی قابل توجہ بات ایک طرح کی اسٹیبلشمنٹ مخالف ریپبلک کا منتخب ہونا ہے۔ یہ بہت

حیران کن بھی نہیں۔ دوسری طرف امریکہ کی سیاسی تاریخ میں برنی سینڈرز (Bernie Sanders) کی بے پناہ کامیابی بھی اہم ہے۔ مگر میڈیا نے ملک کے مقبول ترین سیاست دان کو نظرانداز کیا۔ ممکن تھا کہ وہ ڈیموکریٹک پارٹی کی نامزدگی جیت جاتا اگر پارٹی مینیجرز اپنا کام بہتر انداز میں کرتے۔ کیا مرکز انہدام کی طرف جارہا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی وجہ سماجی اور سیاسی تبدیلیوں میں ڈھونڈی جاسکتی ہے۔ نیولبرل عالمگیریت، جس کی داغ بیل نوے کی دہائی میں رکھی گئی، نے مسائل میں اضافہ کیا ہے۔ وہ جسے آزاد تجارت (free trade) کہتے ہیں، وہ آزادانہ تجارت تو کجا، تجارت کے پیمانوں پر بھی پورا نہیں اترتی۔ وہ سرمایہ کاروں کے حقوق کو انتہائی تحفظ دیتی ہے اور دنیا بھر میں محنت کشوں کو آپس میں مقابلے پر مجبور کرتی ہے۔

پرویز ہودبھائی: شکریہ کہ آپ نے حالات کو ان کے درست تناظر میں بیان کیا۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ موجودہ صورتحال کو ویسا مایوس کن نہیں سمجھتے جیسا کہ وہ بظاہر دکھائی دے رہے ہیں۔ آپ نے امریکہ اور بریگزٹ (Brexit) کے پس منظر کا تذکرہ وضاحت سے کیا، تاہم میں اس بارے میں بھی آپ کی رائے جاننا چاہوں گا کہ مسلمان دنیا میں اس قدر غم وغصہ کیوں پایا جاتا ہے، نہ صرف امریکہ کے خلاف بلکہ اپنے اوپر بھی۔ اسی طرح بھارت کو دیکھیں تو وہاں گاؤ رکشک مسلمانوں کو چیر پھاڑنے کو تیار بیٹھے ہیں، اور میانمار میں بدھ مت کے پرامن نظریئے کے داعی، روہنگیا مسلمانوں پر بے انتہا تشدد کرتے پھر رہے ہیں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟

نوم چومسکی: سب سے پہلے برما کی بات کر لیتے ہیں۔ وہاں بہت اعلیٰ تو نہیں مگر کم از کم پارلیمانی نوعیت کا ایک مناسب جمہوری نظام موجود تھا۔ امریکہ، چین پر حملہ آور ہونے کے لئے اس وقت ہر قدم اٹھانے کو تیار تھا۔ اس غرض سے اس نے برما کے شمال میں چینی قومیت پرستوں کی قبائلی قوت (Chinese Nationalist Tribal Forces) کو تشکیل دینا شروع کیا۔ اس کے نتیجے میں اس قدر انتشار پھیلا اور تباہی بپا ہوئی کہ بالآخر برما میں پارلیمانی جمہوریت کی صف لپیٹ دی گئی اور نتیجتاً ایک بدترین فوجی آمریت نے قدم جمالئے۔ بہت بعد میں آخری دو برسوں میں اس میں کچھ نرمی آئی۔ روہنگیا مسلمانوں پر ہونے والے حملے تشدد کی بدترین قسم ہیں۔ برمی حکومت، بشمول سان سوکی (San Suu Kyi)، کو چاہئے کہ وہ اس ظلم کی حمایت ترک کرے۔

بھارت کا معاملہ پیچیدہ ہے۔ تاریخ یہاں بھی خوشنما نہیں۔ میرا اشارہ ذات پات کے نظام کی طرف ہے جو انسانی وقار کے برخلاف ہے۔ جب میں آخری بار بھارت گیا تو کلکتہ سے لاہور جاتے ہوئے فرق چونکا دینے کی حد تک واضح دکھائی دیا۔ بھارت میں جہاں اچھی باتیں ہیں، وہیں کچھ برائیاں بھی ہیں۔ وہاں مجھے دولت، ثقافت اور روشن خیالی کے ساتھ ساتھ انتہا درجے کی غربت اور رہن سہن کے پست معیار کا بھی مشاہدہ ہوا۔ ممکن ہے ایسا ہی تجربہ آپ کا سنٹرل افریقی ممالک کے بارے میں بھی ہو، مگر خیال رہے کہ بھارت ایک بڑا ملک سمجھا جاتا ہے۔ فی الوقت وہاں پر رجعت پسندی نمایاں ہے۔

جہاں تک اسلامی دنیا کا تعلق ہے، وہ گزشتہ سینکڑوں برسوں سے حملوں اور تشدد کی زد میں ہے۔ مثال کے طور پر ہم شام کو دیکھیں تو اس کی حالت ابتر ہے۔ اگر ہم تناسب کے حساب سے دیکھیں تو شام میں کسی اور ملک کے مقابلے میں زیادہ ہلاکتیں ہوچکی ہیں، جن کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ اول الذکر دیگر مثالوں کی طرح ہمیں یہاں بھی کوئی خوشگوار صورتحال دکھائی نہیں دیتی۔

اسی طرح ایران میں پارلیمانی نظام حکومت تھا۔ اس کا کیا بنا؟ جب انہوں نے اپنے وسائل پر قابو پانے کی 'غلطی' کی تو امریکہ نے وہاں شاہ کے خلاف بغاوت کروادی۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل اور دیگر اداروں نے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی مذمت کی۔ بعد میں ۱۹۷۹ء میں حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ اس کے بعد امریکہ نے کیا کیا؟ اس نے فوری طور پر عراق کو ایران پر حملے کے لئے حمایت فراہم کردی۔ صدام کی کردوں کے خلاف بدترین جارحیت کی بھی

حمایت کی گئی اور ریگن نے صدام کو اس کا ذمہ دار ٹھہرانے سے انکار کرتے ہوئے اس کا الزام بھی ایران پر لگا دیا۔ امریکہ نے صدام کو ایسے اقدام کے لئے بھی چھوٹ دے دی جو وہ شاید ہی کسی کو دے یعنی امریکی بحری جہاز پر حملہ کر کے کئی درجن ملاحوں کو مار دینا اور امریکہ کے غیض وغضب کا شکار بھی نہ ہونا۔ اس پر میرے ذہن میں اسرائیل اور یو ایس ایس لبرٹی (USS Liberty) کی مثالیں آتی ہیں۔ بالآخر امریکہ نے عراق کے لئے جنگ جیتنے کو ممکن بنا دیا۔ کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال ہوا اور ہزاروں ایرانی مارے گئے۔ یوں ہم ایک کے بعد ایک ملک کی تاریخ کا جائزہ لے سکتے ہیں اور نتیجہ بدنما ہی نکلے گا۔ یہ سب مشرق وسطیٰ کا ذکر تھا۔ اس میں صرف امریکہ ہی نے منفی کردار ادا نہیں کیا، بلکہ ہمیں فرانس اور برطانیہ سمیت اور بھی کئی ذمہ داران مل جائیں گے۔ آج کے زمانے میں گزشتہ قریباً دو برسوں سے داعش (ISIS) بدترین تشدد میں ملوث ہے۔ یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ عراق پر امریکی حملے سے قبل کیا داعش کا وجود تھا؟ عراق پر حملہ جہاں اور بہت سے جرائم کا ذمہ دار ہے، وہیں اس نے فرقہ وارانہ تنازعات کو بھی ہوا دی، جو اس سے پہلے منظر عام پر نہ آئے تھے۔ اب ان کے سامنے آنے سے صرف عراق ہی نہیں بلکہ پورا خطہ سنگین خطرات میں گھر گیا ہے۔ حالات خلا میں خرابی کی طرف مائل نہیں ہوتے، بلکہ ان کے پیچھے کئی زمینی محرکات ہوتے ہیں۔ ان وجوہات میں ایک بہت نمایاں کردار مسلمان فرقہ وارانہ ریاستوں کا بھی ہے۔

پرویز ہود بھائی: میں آپ کے تجزیئے سے بڑی حد تک متفق ہوں۔ یہاں میں یہ نکتہ اٹھانا چاہوں گا کہ امریکہ اب زوال پذیر ہے، اور ویسی طاقت نہیں رہا جیسا کہ آج سے پچاس برس قبل تھا۔ اس کی بجائے ہم دیکھ رہے ہیں کہ چین کافی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اس کے اثرات پاکستان میں بہت نمایاں ہیں۔ یہاں چائنا، پاکستان اقتصادی راہداری (CPEC) کے ضمن میں پیش رفت ہو رہی ہے، جس کی وجہ سے چین یہاں کی صنعت میں اپنا اثر ورسوخ بڑھا رہا ہے۔ وہ یہاں پر سڑکوں اور انفراسٹرکچر کی تعمیر میں شامل ہے اور ہمیں یہاں جگہ جگہ چین کے لوگ دکھائی دے رہے ہیں۔ نوم، میں اس بارے میں آپ کی رائے جاننا چاہوں گا کہ اگر ہمارے سامنے ایک ایسی دنیا ہو جہاں امریکہ کی بجائے چین کی بالادستی ہو تو کیسا رہے گا؟ کیا وہ ایک بہتر دنیا ہوگی: ایسی دنیا جس میں سامراجی رجحان کی حوصلہ شکنی ہو اور جو قاعدے اور قوانین کے مطابق چلے، جہاں دنیا جس میں انسانی احسن صفات نمایاں ہوں؟ کیا ایسا ممکن ہے؟

نوم چومسکی: میں نہیں سمجھتا کہ ایسا ہونے کا مستقبل بعید میں بھی کوئی امکان ہے۔ یہ درست ہے کہ امریکہ ایک زوال پذیر عالمی طاقت ہے مگر ایسا ۱۹۴۹ء سے ہے۔ امریکہ اپنی طاقت کے انتہا پر ۱۹۴۵ء میں تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب امریکہ کے پاس دنیا کی قریباً نصف دولت تھی۔ اس کے علاوہ بہترین سیکورٹی کے ساتھ ساتھ وہ نصف کرے (hemisphere) اور دو بحیروں پر بھی کنٹرول رکھتا تھا۔ جہاں دیگر صنعتی معاشرے نہایت کمزور ہو رہے تھے، وہاں دوسری جنگ عظیم کے دوران امریکہ میں اقتصادی تیزی دیکھنے میں آئی۔ بڑی مقدار میں صنعتی پیداوار کے ساتھ امریکہ دنیا میں سب سے اوپر تھا، اور دنیا پر اپنا مکمل تسلط حاصل کرنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ تاہم ۱۹۴۹ء میں کچھ ایسا ہوا جس سے اس کے بالادستی کے خواب کو ٹھیس لگی۔ غیر متوقع طور پر چین میں کمیونسٹ پارٹی اقتدار میں آ گئی اور امریکہ میں لوگوں کو یہ احساس ہونے میں کئی برس لگ گئے کہ ہم نے چین کو کھو دیا ہے۔ اس سب نے امریکہ کی ڈومیسٹک پالیسی میں نمایاں کردار ادا کرتے ہوئے میک کارتھی ازم (McCarthyism) کی بنیاد رکھی اور ایک سخت گیر جبر کو جنم دیا۔ صدر جان ایف کینیڈی کو ویت نام میں دخل اندازی کے معاملے میں یہ خدشہ تھا کہ انڈو، چائنا کے کھو دینے کا الزام اس کے سر نہ آ جائے۔ اسے امریکی طاقت پر ایک کاری ضرب کے طور پر دیکھا گیا۔ پھر ستر کی دہائی کے اوائل میں یہ کافی کمزور پڑ گئی۔ دنیا اقتصادی طور پر سہ قطبی (tripolar) ہو گئی، جس میں شمالی امریکی مرکز، یورپی جرمن کا مرکز اور شمال مشرقی ایشیا میں جاپان کا مرکز شامل تھا۔ اپنی طاقت میں تو یہ ہم پلہ نہ تھے مگر اقتصادی میدان میں خود مختار اور بڑی حد تک قابل موازنہ تھے۔ اگر آپ یاد کریں تو اسی کی دہائی میں جاپان کمپیوٹر کی صنعت میں اول نمبر پر آ گیا تھا اور لگتا تھا کہ وہ دنیا بھر میں چھا جائے گا۔ امریکہ قدرے زوال پذیر تھا اور دنیا کی

دولت میں اس کا حصہ دوسری جنگ عظیم کے بعد کے حصے سے ۲۵ فیصد کم ہو چکا تھا۔

اب ٹرمپ کی آمد سے حالات مزید بدل رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ امریکہ کو تیزی سے زوال پذیر کرانے میں ٹرمپ کا حصہ نمایاں ہوگا۔ وہ اپنے رویے سے امریکہ کو اپنے قریبی حلیفوں سے بھی الگ تھلگ کر رہا ہے۔ اس کے باوجود میرا گمان یہ ہے کہ امریکہ کی طاقت میں طویل مدت میں کوئی نمایاں فرق نہیں پڑے گا اور وہ بدستور ایک بھرپور عسکری طاقت رہے گا، ایک ایسی طاقت جس کا دور دور تک کوئی ثانی نہ ہو۔ وہ اقتصادی طور پر بھی ایک مضبوط قوت رہے گا۔ یہ بات البتہ قدرے توجہ چاہتی ہے کیونکہ معاصر عالمی نظام، جو ۱۹۹۰ء سے وجود میں آیا ہے، میں کارپوریشنز کا ایک پیچیدہ سلسلہ چل رہا ہے۔ مثال کے طور پر آپ ایپل کمپیوٹرز کو لے لیں۔ اگرچہ منافع کا بڑا حصہ امریکہ کو جاتا ہے مگر اس کے اجزا کو چین میں اکٹھا کیا اور جوڑا جاتا ہے، جس میں زیادہ تر تائیوان کی کمپنیاں حاوی رہتی ہیں۔ اس کے اجزا اور پرزے وغیرہ جنوبی کوریا، جاپان اور تائیوان کے بہت سے کاروباری اداروں کی طرف سے تیار اور فراہم کئے جاتے ہیں۔ اس کے دفاتر آئرلینڈ میں ہیں۔ یہ تو بات ہوئی دنیا کی سب سے بڑی کمپنی کی۔ اب ہم اگر عالمی معیشت پر ایک نگاہ ڈالیں تو امریکی کارپوریشنز، دنیا کی نصف معیشت کی مالک دکھائی دیتی ہیں۔ یہ غالباً اس سے بھی بھرپور طاقت ہے جو امریکہ ۱۹۵۰ء میں رکھتا تھا۔ عام طور پر اس پر توجہ نہیں دی جاتی مگر اس کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ قومی اکاؤنٹس آج بھی اپنی ایک وقعت رکھتے ہیں اگرچہ ویسی نہیں جیسا کہ ۱۹۵۰ء میں۔ یہ کارپوریشنز امریکی ہیں اور انہیں سبسڈیز (subsidies) کے علاوہ فوجی اور سفارتکارانہ حمایت بھی ملتی ہے۔ یوں ان کا دنیا پر ایک طرح کا غلبہ ہے۔ دوسری طرف اگر ہم مختلف شعبہ ہائے جات کو دیکھیں، جیسا کہ مینوفیکچرنگ، خوردہ فروشی اور کامرس، تو چین دور دور تک امریکہ کے ہم پلہ نہیں۔ چین ایک ابھرتی ہوئی طاقت ضرور ہے مگر درجہ بندی میں وہ ایک غریب ملک کے طور پر سامنے آتا ہے۔ مثال کے طور پر اقوام متحدہ کے ترقیاتی اشاریے (UN Development Index) کو لیا جائے تو میرا خیال ہے کہ چین کی اس میں درجہ بندی ۹۰ ہے۔ یہ درست ہے کہ چین نمایاں طور پر آگے بڑھ رہا ہے مگر اسے مغرب کے برعکس بہت سے اندرونی مسائل کا سامنا ہے۔ ان میں ماحولیاتی اور آبادیاتی مسائل بھی شامل ہیں۔

چین، جسے پاکستان کا تعاون حاصل ہے، یہ کوشش کر رہا ہے کہ وہ مغرب تک اپنے سماجی اور اقتصادی نظام کو وسعت دے سکے۔ شنگھائی کارپوریشن آرگنائزیشن کے تحت ایسا گزشتہ کچھ برسوں سے جاری ہے اور یوں چین، پاکستان میں کئی پراجیکٹس پر کام کر رہا ہے، جیسا کہ گوادر بندرگاہ کی تعمیر وغیرہ۔ چین اس تگ ودو میں ہے کہ تیل کی فراہمی کی معاملے میں آبنائے ملاکہ (Malacca Straits) میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی قوت کو توڑا جا سکے۔ چین، ایشیائی ترقیاتی بنک کے ذریعے پاکستان، ایران، ترکی اور یورپ کے ساتھ اتحاد بنا رہا ہے۔ امریکہ سے باہر چین ایک اہم ملک کے طور ابھر رہا ہے اور آنے والے وقتوں میں چین کے اثر ورسوخ میں یقینی طور پر اضافہ ہوگا۔ تاہم یہ ایک سست روعمل ہے اور اس کے لئے اسے بہت وقت درکار ہوگا۔ چین، افریقہ میں بھی ترقیاتی اور تعمیراتی کام کر رہا ہے۔ مگر یاد رہے کہ برطانیہ بھی ایسے کام بھارت میں کر چکا ہے۔ برطانوی راج کا نتیجہ کافی برا نکلا تھا اور ویسے ہی کی توقع ہم یہاں بھی رکھ سکتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی میں نہیں سمجھتا کہ فی الوقت چین، امریکہ کے ہم پلہ ہونے کے قابل ہے۔

پرویز ہود بھائی: ایک زمانے میں امریکہ کے بارے میں یہ تاثر عام تھا کہ پاکستان میں حکومتیں، اس کی رضامندی سے بنتی اور ٹوٹتی ہیں۔ امریکہ پاکستانی فوج کو اسلحہ اور لڑاکا طیارے فراہم کرتا تھا اور اس کا یہاں اچھا خاصا اثر ورسوخ تھا۔ اب یہ بات درست نہیں رہی۔ امریکہ کی موجودگی ماند پڑتی دکھائی دے رہی ہے۔ اس کے برعکس اب پاکستانی ایئرفورس کے پاس چینی فائٹر جیٹس ہیں۔ پاک، چین دوستی، شہد سے زیادہ شیریں اور ہمالیہ سے زیادہ بلند قامت تصور کی جاتی ہے اور یوں چین کا عمل دخل ہر طرف دکھائی دینے لگا ہے۔ کیا پاکستانیوں کو اس نوعیت کے تعلقات کے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت ہے؟

نوم چومسکی: آپ کو ہر بڑی طاقت کے بارے میں متفکر رہنا چاہئے، اور چین ان میں سے ایک ہے۔ پاکستان میں چین کی موجودگی کے بارے میں آپ نے جو نقشہ کھینچا، وہ درست ہے۔ چین کی موجودگی اس وقت ہر جگہ ہے۔ مثال کے طور پر جنوبی امریکہ، جیسا کہ برازیل، میں چینی اشیاء مل جاتی ہیں۔ جنوبی امریکہ میں بنیادی مصنوعات کے وسائل پر چین اپنا قبضہ جمانے میں کامیاب ہوگیا ہے، جس کی وجہ سے وہ وہاں پہ ستا مال بھیجنے کی پوزیشن میں ہے۔ اس کے نتیجے میں وہاں کے ڈومیسٹک مینوفیکچرز اور مقامی صنعت کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ یوں مسائل جنم لیتے ہیں مگر امریکہ کے برعکس، وہ حکومتیں گرا کر یا فوجی حکومتیں قائم کر کے، یا معیشت پر کوئی بہت بڑا حملہ کر کے اپنا اثر نہیں ڈال رہا۔ اس حساب سے وہ امریکہ یا دیگر مغربی سامراجی قوتوں جیسا کہ برطانیہ اور فرانس سے کوسوں دور دکھائی دیتا ہے۔

پرویز ہود بھائی: نوم! یہاں پاکستان میں کوئی بھی جوہری ہتھیاروں کی تباہ کاریوں کے بارے میں خاص فکر مند دکھائی نہیں دیتا۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ہم ایک غیر معمولی خطرناک دور میں داخل ہو چکے ہیں، جس میں لائن آف کنٹرول میں روزانہ جھڑپیں رہتی ہیں۔ دوسری طرف پاکستان ٹیکٹیکل جوہری ہتھیار (tactical nuclear weapons) بنا رہا ہے جن کو استعمال کرنا قدرے آسان مگر اس کے نتائج کو اپنے قابو میں رکھنا دشوار عمل ہے۔ اسی طرح بھارت جوہری آبدوزیں اور جوہری بیلسٹک میزائل حاصل کر رہا ہے۔ یہ ایک تشویشناک صورتحال ہے۔ جب ہم شمالی کوریا پر نظر ڈالیں تو وہاں معاملات مزید خطرناک حد تک جا چکے ہیں جہاں کی حکومت نہ صرف میزائل بنا رہی ہے بلکہ انتہائی مہلک ہائیڈروجن بم بھی بنانے کا اعلان کر چکی ہے۔ آپ ان معاملات کو آگے کہاں تک بڑھتا دیکھتے ہیں؟ کیا حالات ابھی بھی ہمارے قابو میں ہیں؟

نوم چومسکی: آیئے ان تمام موضوعات پر ایک ایک کر کے بات کرتے ہیں۔ پہلے پاکستان اور بھارت کے درمیان جاری جوہری دوڑ کو دیکھیں۔ بھارت نے اس ضمن میں پہل کی اور پاکستان نے اس کے ردعمل میں ایسا ہی کیا۔ ابتدا میں امریکہ نے بھارت کے جوہری ہتھیاروں کی تیاری کی مخالفت کی، یہاں تک کہ جارج بش انتظامیہ کی باری آئی جس نے بھارت کی حمایت کرنے کا فیصلہ کیا۔ بہت سی چالبازیاں کی گئیں جن کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ نتیجے کے طور پر بھارت کو اپنے جوہری ہتھیاروں کے لئے امریکہ کی موثر حمایت مل گئی اور ساتھ میں عالمی جوہری کنٹرول گروپ میں اپنے اسلحے کی تائید حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔ جہاں تک پاکستان کی بات ہے تو ۱۹۸۰ء میں ضیاء الحق کے دور میں پاکستان نے جوہری ہتھیار تیار کرنے شروع کئے۔ ریگن انتظامیہ نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ اس سب سے لاعلم ہے۔ پاکستان میں اپنے انٹیلی جنس اثاثوں کی موجودگی میں یہ قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ امریکہ اس سے بے خبر تھا۔ بہرحال اس نے ایسا ہی ظاہر کیا۔ امریکہ، افغانستان میں اپنی پالیسیوں کے تسلسل کے لئے پاکستان کو فنڈ دینا جاری رکھنا چاہتا تھا، جن کا افغانی عوام کی مدد کرنے سے کوئی لینا دینا نہ تھا۔ اگر آپ یاد کریں تو سی آئی اے کے چیف نے اسلام آباد میں بہت واضح طور پر کہا تھا کہ ہم افغانستان میں روسیوں کو نقصان پہنچانے اور انہیں لہولہان کرنے کی غرض سے گئے ہیں۔ لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لئے امریکہ نے افغانستان کو تباہ کر ڈالا اور پاکستان کو جوہری ہتھیاروں کی تیاری میں مشغول دیکھ کر خاموش تماشائی بنا رہا۔ میری تصحیح کیجئے گا اگر میں درست نہیں کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان بنیادی تنازعہ کشمیر کے معاملے پر ہے۔ جب تک اس مسئلے کا کوئی حل نہیں نکلتا، تناؤ کی کیفیت برقرار رہے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم کچھ حل سوچ سکتے ہیں، جیسا کہ اقبال احمد نے اس حوالے سے بہت مناسب تجاویز پیش کی تھیں جو آج بھی قابل عمل ہیں۔ اگر ان پر توجہ دی جائے تو ممکن ہے کہ پاکستان اور بھارت کے مابین جاری فوجی کشیدگی میں کمی آجائے اور جنوبی ایشیا، جوہری ہتھیاروں سے پاک علاقہ یعنی Nuclear Weapon Free Zone بننے کی طرف پیش قدمی کر سکے۔ جب ایسا دنیا میں دیگر جگھوں، جیسا کہ امریکہ اور کینیڈا کے علاوہ باقی کے مغربی نصف کرے (Western Hemisphere)، میں ہو چکا ہے تو ہم اس کا تصور جنوبی ایشیا میں بھی کر سکتے ہیں۔ افریقہ بھی نیوکلیئر فری زون رکھتا ہے، یہ اور بات کہ ڈیگو گارشیا (Diego Garcia) کی وجہ سے ایسا مکمل

طور پر نہیں ہوسکا۔ امریکہ، ڈیگو گارشیا کے جزیرے پر بھرپور جوہری موجودگی قائم رکھنے پر مصر ہے، جب کہ افریقہ اس جزیرے کو اپنا حصہ سمجھتا ہے۔ پیسیفک (Pacific) بھی قریباً نیوکلیئر فری زون ہو چکا ہے۔ شروع میں فرانس نے ایسا ہونے سے روکنے کی کوشش کی کیونکہ وہ وہاں موجود جزیروں پر جوہری تجربات کرنا چاہتا تھا۔ اسی طرح حال ہی میں امریکہ نے بھی ایسا ہونے سے روکا کیونکہ وہ جوہری ہتھیاروں کی گزرگاہ کو اپنے تصرف میں رکھنے کا خواہش مند ہے۔

مشرق وسطیٰ کی صورتحال سب سے دلچسپ ہے۔ میں شمالی کوریا کی طرف ٹھہر کر آؤں گا، پہلے ایران کی بات کر لیتے ہیں جہاں ہم ایک سنگین بحران کو جنم لیتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ ٹرمپ انتظامیہ نے ایران کی توثیق ختم (decertify) کرنے کا اعلان کیا ہے۔ سوال اٹھتا ہے کہ کیا کانگریس، ایران پر پابندیاں عائد کرے گی؟ اگر یہ سب ہو جاتا ہے تو پھر ایران، امریکہ معاہدہ ختم ہو جائے گا۔ ایران اس سب پر ردعمل دکھا سکتا ہے۔ اور اگر ایسا ہوا تو پھر کیا منظرنامہ بنے گا؟ اس حوالے سے ہم ریپبلکن پارٹی کے سینیٹرز کی آراء سن سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر دائیں بازو کے نمائندہ ٹام کاٹن (Tom Cotton) کا کہنا ہے کہ اگر ہم نے ایران کو کچھ بھی کرتے پایا تو ہم ایران پر بم برسا دیں گے۔ دوسری طرف ریپبلکن پارٹی ہی کے سینیٹر باب کارکر (Bob Corker) نے حال ہی میں یہ کہہ کر استعفیٰ دے دیا ہے کہ وہ اس پاگل پن سے متفق نہیں۔ اس نے امریکی حکمت عملی کا پول کھولتے ہوئے کہا کہ ایران کو کسی قسم کی خلاف ورزی پر اکسایا جا رہا ہے، جسے جواز بنا کر ایران پر حملہ کیا جا سکے۔ اس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایران کو کس صورتحال کا سامنا ہے۔ ایرانی ہتھیاروں کے معاملے میں آخر مسئلہ کیا ہے؟ امریکی انٹیلی جنس یہ واضح کر چکی ہے کہ یہ ہتھیار ایران کی ڈیٹرنس حکمت عملی (deterrence strategy) کا حصہ بنیں گے۔ یہ بات باب کارکر نے تو نہیں کی مگر میں اس کا خود سے اضافہ کر رہا ہوں کہ بدمعاش ریاستیں (rogue states) جیسا کہ امریکہ اور اسرائیل ایسا برداشت نہیں کر سکتیں۔ ایران یہ نہیں کہہ رہا کہ وہ جوہری ہتھیار استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، البتہ وہ انہیں بطور ڈیٹرنٹ رکھنا چاہتا ہے۔ دوسری طرف وہ ریاستیں جو خطے میں آزادانہ دندنانا چاہتی ہیں، وہ ایسی کسی ریاست کا وجود پسند نہیں کرتیں جو ڈیٹرنس رکھے۔ لہٰذا بالفرض ایران ویسا کوئی قدم اٹھائے جسے امریکی انتظامیہ اور کانگریس خلاف ورزی کا نام دیں تو ممکن ہے کہ اسرائیل، ایران پر بموں سے حملہ آور ہو جائے اور پھر امریکہ اس کا ساتھ نبھانے آن پہنچے۔ اس کا قبل از وقت اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ ایسا ہونے پر کیا صورتحال بنے گی اور دنیا کس طرف چل نکلے گی۔ کیا ایسے منظرنامے سے بچنے کے لئے کوئی ممکنہ راستہ موجود ہے؟ ہاں، اور وہ بہت سادہ ہے۔ تمام یورپین اسے جانتے ہیں، بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ ساری دنیا اس سے آگاہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایران سے کئے گئے معاہدے کو جاری رکھا جائے۔ میری رائے میں وہ معاہدہ ایران کے لئے بہت سخت گیر ہے، مگر یہ ایک مختلف معاملہ ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ایران اس معاہدے کے ساتھ چل رہا ہے، تو ضروری ہے کہ اس معاہدے کی پاسداری کی جائے۔ کیا اس کے علاوہ بھی کوئی ممکنہ صورت ہے؟ ہاں، اور وہ یہ ہے کہ ایران کی اس تجویز کو تسلیم کر لیا جائے کہ مشرق وسطیٰ میں نیوکلیئر فری زون تشکیل دیا جائے۔ یہ بہت اہم پیش رفت ہوگی اور ایران اس کی حمایت کر رہا ہے۔ دیگر غیر وابستہ (non-aligned) ممالک بھی برسوں سے اس پر زور دے رہے ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ بھی یہ عزم رکھتے ہیں، یہ اور بات کہ وہ ایسا اپنی زبان سے نہیں کہیں گے۔ جب انہوں نے ۲۰۰۳ء میں ایران پر حملے کا فیصلہ کیا تو اس کے عذر کے طور پر پہلے انہوں نے ایران سے ایک معاہدہ کیا۔ اگر آپ اس معاہدے کے آرٹیکل ۱۴ کو پڑھیں تو وہ کہتا ہے کہ امریکہ اور برطانیہ مشرق وسطیٰ کو نیوکلیئر فری زون بنائیں گے۔ وہ اب اس کا حوالہ نہیں دیتے جن کی وجوہات کو ہم سمجھ سکتے ہیں، مگر ہم ان کی کہی بات کو اس معاہدے میں پا سکتے ہیں۔ تمام دنیا، کم از کم کہنے کی حد تک، اس تجویز کی حمایت کرتی ہے مگر ایسا عملی طور پر ہوتا دکھائی نہیں دیتا کیونکہ امریکہ ایسا نہیں ہونے کا روادار نہیں۔ ہر برس نیوکلیئر ریویو سیشنز (nuclear review sessions) میں ہر کوئی یہی بات کرتا ہے، جیسا کہ آخری بار ۲۰۱۵ء میں۔ ہر کوئی یہ بھی جانتا ہے کہ ایسا ہونا کیوں ممکن نہیں۔ صرف ایک وجہ اور وہ یہ کہ ایسا ہونے کی صورت میں اسرائیل

کے جوہری ہتھیار عالمی معائنہ کاری کی زد میں آ جائیں گے۔

اس گفتگو میں ہم نے دنیا کے بیشتر حصوں کا احاطہ کرلیا ہے ماسوائے شمالی کوریا۔ کیا اس مسئلے کا کوئی حل ممکن ہے؟ اس کا جواب بھی ہاں میں ہے اور ہر کوئی اس سے آگاہ ہے۔ وہ حل یہ ہے کہ روس کی حمایت سے اور شمالی کوریا کو تسلیم کرتے ہوئے چین کی تجویز کو منظور کرلیا جائے۔ اس حل کو Double Freeze کا نام دیا گیا ہے۔ شمالی کوریا اپنے جوہری پروگرام کو فریز یعنی روک دے اور امریکہ شمالی کوریا کی سرحد پر فوجی مداخلت کی دھمکیوں سے باز آ جائے، جیسا کہ سرحد کے اوپر کوئی جوہری بمبار پرواز نہ کرے۔ اس طرح کے دیگر کچھ اقدامات۔ شمالی کوریا کچھ تلخ حافظہ رکھتا ہے۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا مگر شمالی کوریا کا وحشیانہ حملوں میں نام ونشان مٹا دیا گیا تھا، خاص طور پر جب ۳۸ ویں متوازی (38th parallel) میں جنگ اپنے اختتام کو پہنچ گئی تھی۔ انتہائی ظلم اور بربریت کا مظاہرہ ہوا۔ آپ کو اگر یاد ہو تو اس میں ایسے جرائم شامل تھے جیسے ڈیموں پر بموں سے حملے۔

مسئلے کے حل کی طرف پہلا قدم اٹھانے کے بعد کیا کیا جائے؟ مذاکرات اور سفارتکاری! کیا ان کی کامیابی کا امکان ہے؟ ہاں، ایسا ہوسکتا ہے۔ اب ذرا پچھلے ریکارڈ پر ایک نظر ڈالیں جو حوصلہ افزا نہیں ہے۔ ۲۰۰۵ء کے معاہدے میں شمالی کوریا نے یہ تسلیم کیا کہ وہ اپنا جوہری پروگرام ختم کردے گا اور اس کے بدلے میں اسے مغرب کچھ رعایتیں دے گا۔ مثال کے طور پر امریکہ، شمالی کوریا کو دھمکیاں دینا بند کردے گا، تحقیقی اور طبی ضروریات کے لئے افزودہ یورینیئم (low uranium enrichment plan) کا حصول یقینی بنائے گا، اور اس کے اقتصادی اقدامات میں مداخلت نہیں کرے گا۔ بش انتظامیہ ان سب سے پیچھے ہٹ گئی اور اس کے نتیجے میں شمالی کوریا نے ہتھیاروں کی تیاری کا عمل پھر سے شروع کردیا۔ بلاشبہ اب وہ ایک ہولناک جگہ بن چکا ہے مگر اسے ایسا کرنے پر اکسایا گیا ہے۔ مگر کیا سفارتکاری کے ذریعے پیش رفت ممکن ہے؟ ہاں، ایسا ہوسکتا ہے۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس معاملے میں بھی ممکنہ حل موجود ہے۔

جنوبی کوریا کی 'سن شائن پالیسی' (Sunshine Policy) یہ تھی کہ شمالی کوریا کے ساتھ تعلقات کی کشیدگی کم کرنے کے لئے تجارتی، ثقافتی اور دیگر روابط قائم کئے جائیں۔ مگر اس میں حیرانی نہیں ہونی چاہئے کہ حکومتیں اپنی بقا کے بارے میں بھی فکرمند رہتیں اور معاشی ترقی کی بھی خواہاں ہوتی ہیں۔ گزشتہ کچھ برسوں میں کچھ معاشی ترقی ہوئی ہے جن کے نتیجے میں مزید پرامن تعلقات کے قیام، یہاں تک کہ خطے میں تخفیف اسلحہ (denuclearization) کا بھی امکان موجود ہے۔ اور جہاں تک بڑی جوہری طاقتوں کا تعلق ہے، وہ جوہری عدم پھیلاؤ (Non Proliferation Treaty) کی قائل ہیں۔ اگر ضروری دباؤ ڈالا جائے تو ممکن ہے کہ اس پر عمل درآمد بھی ہوجائے۔ لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ یہ سب ایک ہولناک خطرے سے کم نہیں مگر ابھی یہ معاملہ انسانی اختیار سے باہر نہیں گیا۔ یہ ابھی بھی مکمل طور پر اپنے بس میں ہے۔

پرویز ہود بھائی: نوم! یہ بہت متاثر کن ہے کہ آپ نے اپنا پہلا آرٹیکل ۱۹۳۹ء میں کم سنی میں تحریر کیا۔ آپ نے بطور ایکٹوسٹ (activist) ایک فعال زندگی گزاری ہے۔ آپ ان تمام غلط چیزوں کے خلاف صف آراء ہیں جن کا ذمہ دار امریکہ ہے۔ کیا آپ موجودہ دنیا کو پہلے سے بہتر دیکھتے ہیں، مثال کے طور پر دوسری جنگ عظیم کے اختتام کے مقابلے میں جسے ہم انتہائی تکلیف دہ عرصے کے طور پر جانتے ہیں۔ مزید یہ کہ جوں جوں وقت آگے بڑھ رہا ہے، کیا آپ کسی قسم کی بہتری یا امید کا امکان پاتے ہیں؟ مجھے یقین ہے کہ اسٹیون پنکر (Steven Pinker) کی کتاب ''The Better Angels of Our Nature'' آپ کی نظر سے گزری ہوگی۔ وہ کہتا ہے کہ پچھلے پانچ ہزار برسوں یا یوں کہیں کہ ریکارڈ شدہ انسانی تاریخ میں ہم مسلسل بہتری کی طرف گامزن ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ایسا ہی ہے؟ بادی النظر میں تو ایسا دکھائی نہیں دیتا۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟

نوم چومسکی: اس ضخیم کتاب کو فی الوقت ایک طرف رکھتے ہیں۔ میرا نہیں خیال کہ مجھے اس سے کوئی خاص مسئلہ ہے۔ اس کا کچھ حصہ درست ہے۔ ایک اہم

بات یہ کہ ۱۹۴۵ء کے بعد سے یورپی ممالک نے یہ جان لیا تھا کہ وہ اپنا پسندیدہ کھیل مزید جاری نہیں رکھ سکتے۔ صدیوں تک یورپ، دنیا کا سب سے وحشیانہ مقام تھا۔ سترہویں صدی عیسوی میں تیس سالہ جنگ نے جرمنی کی قریباً دو تہائی آبادی کو ختم کر دیا۔ اس کے بعد یورپی بربریت دنیا کے ایک وسیع علاقے تک پھیلتی چلی گئی، جس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ آخری نمایاں تباہی دوسری جنگ عظیم کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ یورپ نے ۱۹۴۵ء تک یہ جان لیا تھا کہ وہ اپنا کھیل مزید جاری نہیں رکھ سکتے۔ اگر یورپی طاقتوں کے مابین کوئی بڑی جنگ ہوئی تو سب مارے جائیں گے۔ لہٰذا یہ طے کیا گیا کہ یورپ امن سے رہے گا اور یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اگر آپ گزشتہ صدیوں کی تاریخ سامنے رکھیں تو یہ ایک بڑی پیش رفت تھی۔ میرا نہیں خیال کہ اس کا لینا دینا ہماری سرشت کے بہتر فرشتوں سے ہے، اس کے برعکس مجھے بدترین شیاطین زیادہ حاوی دکھائی دیتے ہیں، جنھوں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان سے انسان صفحہ ہستی سے مٹ سکتا ہے، ہلاکت کے ہتھیار بنائے۔ اس خطرے کا ادراک، اس اہم تبدیلی کا ایک نمایاں عنصر تھا جو وجود میں آئی۔ میں اضافہ کرتا چلوں کہ عالمانہ ادب اس کی ایک مختلف وضاحت پیش کرتا ہے، البتہ میں اس بارے میں تشکیک کا رویہ رکھتا ہوں۔

ایک اور حقیقت یہ ہے کہ روشن خیالی (Enlightenment) کے عہد کے بعد آبادی کے ایک حصے میں خرد افروزی، اخلاقی ذمہ داریوں کا احساس اور انسانی حقوق کا شعور جاگا۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ روشن خیالی اور اس کے بعد کا زمانہ مغربی سامراج اور اس کے ہولناک نتائج کے تناظر میں ایک بدترین دور تھا۔ مغربی نصف کرے میں آبادی، جو غالباً ۸۰ ملین نفوس پر مشتمل تھی، گھٹ کر محض چند لاکھ رہ گئی۔ اسی طرح شمالی علاقے کی لگ بھگ ۱۸ ملین کی آبادی کم ہوتے ہوتے چند ملین افراد پر منتج ہوئی۔ اس سے انسانی قتل عام کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اور یہ سب روشن خیالی کے زمانے میں ہوا۔ البتہ باقی دنیا کے لئے یہ بات درست ہے کہ اخلاقی اور دانشوارانہ سطح پر ایک نمایاں پیش رفت ہوئی۔ اور اس کا اثر بالآخر امریکہ پر بھی پڑا۔ آج سے ساٹھ برس پہلے کے مقابلے میں آج کا امریکہ بہت سے پہلوؤں سے ایک مہذب ملک ہے۔ مثال کے طور پر خواتین کے حقوق کے معاملے میں تبدیلی آئی ہے۔ اسی طرح شہری حقوق جو پہلے ناگفتہ بہ تھے اب بہتر ہیں اور جبر کی مخالفت کا جذبہ ابھرا ہے وغیرہ۔ جب امریکہ نے ویتنام پر حملہ کیا تو اس کے بدترین جرائم کے خلاف کوئی احتجاج دیکھنے کو نہ ملا۔ یوں معاشرے میں حالات سے مطابقت پزیری کو برسوں لگ گئے۔ اس میں تبدیلی آئی ہے۔ اسی طرح دیر سے ہی سہی، مگر بہرحال ماحولیاتی تباہی کی بابت بھی کسی حد تک آگاہی جنم لے رہی ہے، جس ضمن میں اگر بروقت اقدام نہ کئے گئے تو گھمبیر مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ سب اچھی پیش رفت ہیں، اگرچہ یہ جزوی ہیں کیونکہ ساتھ ساتھ دیگر ناپسندیدہ عوامل بھی چل رہے ہیں۔ یوں معاملات، مثبت اور منفی، ہر سمت میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ اگر بحثیت مجموعی دیکھا جائے تو ہم مہذب انسانی معاشروں کے قیام کی طرف سفر میں ہیں۔

پرویز ہودبھائی: یہ ایک طویل انٹرویو تھا، جس کے لیے میں آپ کا شکرگزار ہوں۔ مگر میں اس آخری سوال کا جواب لئے بغیر آپ کو جانے نہیں دوں گا۔ آپ نے تدریس اور ایکٹوازم (activism) کی ایک طویل اور بھرپور زندگی گزاری ہے۔ آپ نے بارہا حالات کو بگڑتے اور تنزلی کی طرف جاتے ہوئے دیکھا مگر اس سب کے باوجود آپ نے کبھی ہمت نہ ہاری۔ آخر وہ کیا شے ہے جو آپ کو حوصلہ مند اور پرامید رکھتی ہے اور آپ کو آگے بڑھتے رہنے کے لئے توانائی فراہم کرتی ہے؟

نوم چومسکی: اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ بہت سی مثبت اور حوصلہ افزا چیزیں۔ اور ساتھ ساتھ جو بری باتیں ہو رہی ہیں، وہ اس بات کی علامت ہیں کہ ابھی کرنے کو بہت کچھ باقی ہے۔

پرویز ہودبھائی: آپ ایک زبردست آدمی ہیں، نوم۔ مجھے خوشی ہے کہ مجھے آپ سے گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ اپنا خیال رکھئے گا۔ بائے۔

نوم چومسکی: مجھے بھی آپ سے بات کر کے خوشی ہوئی۔ بائے۔

EQBAL AHMAD
Centre for Public Education
Reason in the Service of Compassion

**www.eacpe.org**

**www.Twitter.com/eacpe_pk**

**www.Facebook.com/EACPE.Official**